1

محمد احمد خان

عقل و وجدان اقبال کی نظر میں

(۱)

انسان خارجی دنیا یا اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی کائنات کے متعلق معلومات حواسِ ظاہری سے (خواہ بالراست ہو یا بالواسطہ یعنی آلاتِ سائنس کی مدد سے) حاصل کرتا ہے ۔ پھر ان معلومات کو منطقی انداز میں ترتیب دے کر ان سے نتائج اخذ کرتا اور ان اخذ کردہ نتائج کو تجربی طریقوں سے پرکھتا ہے ۔ یہی موجودہ سائنس یا علومِ جدیدہ کا طریقۂ کار ہے ۔ اس طریقے سے حاصل کردہ علم کو اقبال علم بالحواس کہتے ہیں ۔ اس کا موضوع ہے آفاق ! اس کو وہ ''علوم طبیعی'' یا پھر اختصاراً ''علم'' و ''خبر'' ، ''عقل'' و ''خرد'' سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کائنات سے ماورا یا مظاہرِ فطرت کے پسِ پردہ اور انسان کے اپنے اندرونِ ذات میں جو حقیقت پوشیدہ ہے ، اس تک رسائی حواس سے نہیں بلکہ ماورا حواس ایک ''اندرونی بصیرت'' سے ہی ہو سکتی ہے ۔ اس کو وہ ''وجدان'' ، ''عشق'' ، ''جنون'' ، ''جذبِ اندرون'' اور اختصاراً ''نظر'' ، ''دل'' یا پھر قرآن مجید کے تتبع میں ''قلب'' سے تعبیر کرتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

''ہم اپنے بالمقابل جس حقیقت سے دو چار ہوتے ہیں ، اس سے ربط و اتصال کا ایک بالواسطہ طریق یہ ہے کہ اس کی آیات [نشانیوں] کے مشاہدے میں جیسا کہ ادراکِ بالحواس سے ان کا انکشاف ہوتا ہے غور و فکر سے کام لیں اور یوں ان پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کریں ۔ لیکن اس کا ایک دوسرا طریق یہ ہوگا کہ حقیقت سے ، جیسا کہ اس کا انکشاف ہمارے اندرونِ ذات میں ہوتا ہے ، براہِ راست تعلق پیدا کیا جائے ۔''[۱]

۱۔ سید نذیر نیازی ، مترجم ، (اقبال) ، ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' (لاہور ، بزمِ اقبال ، ۱۹۵۸) ، ص ۲۲ ۔

اسی سلسلے میں وہ اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ قرآن مجید نے مشاہدۂ فطرت کی ترغیب دی ہے تاکہ ہم قویٰ فطرت پر غلبہ اس مقصدِ عظیم کے لیے حاصل کریں کہ ہمیں اپنی روحانی زندگی میں آزادی کے ساتھ مدارجِ کمال کی طرف بڑھنا ہے ۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :

''یہی وجہ ہے کہ حقیقتِ مطلقہ کے تمام و کمال لقا کی خاطر ادراکِ بالحواس کے ساتھ ساتھ اس چیز کے مدرکات کا اضافہ بھی ضروری ہے جسے قرآن پاک نے 'فواد' یا قلب سے تعبیر کیا ۔ ۔ ۔ ۔ 'قلب' کو ایک طرح کا وجدان یا اندرونی بصیرت کہیے جس کی پرورش مولینا روم کے دلکش الفاظ میں نورِ آفتاب سے ہوتی ہے اور جس کی بدولت ہم حقیقتِ مطلقہ کے ان پہلوؤں سے اتصال پیدا کر لیتے ہیں جو ادراکِ بالحواس سے ماورا ہیں ۔ قرآن مجید کے نزدیک قلب کو قوتِ دید حاصل ہے اور اس کی اطلاعات ، بشرطیکہ ان کی تعبیر صحت کے ساتھ کی جائے ، کبھی غلط نہیں ہوتیں ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کوئی پُر اسرار قوت ہے ۔ اسے دراصل حقیقتِ مطلقہ تک پہنچنے کا وہ طریق ٹھہرانا چاہیے جس میں باعتبار عضویات حواس کا مطلق دخل نہیں ہوتا ۔ یا ایں ہمہ اس طرح حصولِ علم کا جو ذریعہ پیدا ہوتا ہے ایسا ہی قابل اعتماد ہوگا جیسے کسی دوسرے مشاہدے سے ۔''[۲]

''وجدان'' یا ''عشق'' کا ذکر اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا دل کھول کر کیا ہے ۔ ان کے پورے کلام کو اگر آپ ایک مرتبہ پڑھ جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے سارے کلام پر تصورِ خودی کے بعد یہی وجدان چھایا ہوا ہے ۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کا پیام ''پیامِ عشق و وجدان'' ہی ہے ۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :

جز عشق حکایتے ندارم پروائے ملامتے ندارم

ایک اور جگہ وہ مزید صراحت کرتے ہیں :

چون رومی در حرم دادم اذانِ من ازو آموختم اسرارِ جانِ من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن اُو بہ دور فتنۂ عصرِ روانِ من

مولانا روم بھی ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے تھے جب ملتِ اسلامیہ میں حکمتِ یونان کا اتنا زور تھا کہ لوگوں نے ''وجدان'' و ''عشق'' کی طرف

۲۔ ایضاً ، ص ۲۳ ۔

سے آنکھیں بند کر لی تھیں اور عقل و خرد ہی کو حقیقتِ کُلی سے آگاہی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ سمجھ رکھا تھا ۔ مولانا روم کا کلام عقل و خرد کی جامد تحریک کے خلاف ایک پُر زور احتجاج تھا ۔ انھوں نے بھی پورے زور و شور کے ساتھ ''عشق و وجدان'' کا نعرہ لگایا ۔ کچھ یہی حال اقبال کا ہے کہ موجودہ دورِ عقلیت و سائنس (حکمت) میں اقبال نے بھی ''حکایتِ عشق و جنوں'' بڑے سوز و گداز سے سنائی ہے !

وہ کہتے ہیں کہ ''عشق'' کا مقام بہت بلند ہے ۔ وہ ناموسِ اکبر ، فرشتۂ مقرب جبریلِ امین کی جان ، عبدِ کامل ، پیمبرِ برگزیدہ محمد مصطفیٰ کا دل ، اور خدا کا کلام و پیام ہے ۔ وہ ایک شراب ہے ، شراب طہور ، اور ایک جام ہے ، جامِ نور ! اس کی مستی سے پیکرِ خاکی سر تا پا تابناک بن جاتا ہے ۔ وہ فقیہِ حرم بھی ہے اور عساکرِ مملکتِ روحانی کا سالار بھی ۔ وہ ایک ایسا مسافر ہے جو ہر لمحہ ایک نئی منزل پر نظر آتا ہے ۔ اس کے مضراب سے نغمہ ہائے سرمدی پھوٹ نکلتے ہیں ۔ زندگی کے دو پہلو ہیں — ''جمال'' و ''جلال'' اور یہ دونوں اسی کا ہر تو ہیں کیونکہ یہی نورِ حیات بھی ہے اور نارِ حیات بھی ۔ فرماتے ہیں :

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق ہے فقیہِ حرم ، عشق ہے امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق ہے نورِ حیات عشق ہے نارِ حیات

عشق کے اثرات کا کون اندازہ کر سکتا ہے ! اسی کے ساز سے زندگی کی نواؤں میں ''زیر و بم'' پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے سوز سے مٹی کی مورتوں میں جان پڑ جاتی ہے :

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

اس کی طاقت کا کون احاطہ کر سکتا ہے ! اس کے زور سے ایک نانِ جویں

کھانے والے نے درِ خیبر کو اُکھاڑ پھینکا تھا ۔ اس کی قوت سے ایک کملی والے نے چاند کو شق کر دیا تھا ۔ نمرود جیسے جبار کے تاج کو اسی عشق نے بغیر کسی ضرب کے پاؤں تلے روندا تھا اور فرعون جیسے قہار کے لشکر کو بغیر کسی حرب کے شکستِ فاش دی تھی :

عشق با نانِ جویں خیبر گشاد　　عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد
کہ نمرود بے ضربے شکست　　لشکرِ فرعون بے حربے شکست

اس زمین و آسمان کی پہنائیوں کو دیکھو ، کس قدر وسیع ہیں ۔ انسانی ذہن ، باوجود اپنی لگاتار جستجو اور پے در پے کامیابی کے ، ان کو "بے کراں" سمجھتا اور ان کی وسعتوں کو ناقابلِ عبور تصور کرتا رہا ہے ، مگر عشق میں وہ بے پناہ طاقت ہے کہ اس کی ایک ہی چھلانگ نے اس مرئی کائنات کی بظاہر لامحدود وسعتوں کے پرے انسان کو پہنچا دیا :

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

عشق کے جلال و جبروت کا نقشہ کون کھینچ سکتا ہے ! وہ ایک برہان ہے — برہانِ مبین ! وہ ایک روحانی طاقت اور نورانی قوت ہے ۔ اسی لیے اس کی فرماں روائی اس کائنات پر بھی ہے اور اس سے پرے ماورا کائنات پر بھی :

عشق سلطان است و برہانِ مبین　　ہر دو عالم عشق را زیرِ نگین !

عشق یا وجدان کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنی ذات کا شعور عطا کرتا ہے ، اس کو خود شناس و خود آگاہ بناتا ہے اور جب انسان خود آگاہ ہو جاتا ہے ، تو اس وسیع و عریض کائنات میں ، حقیر و ذرۂ بے مقدار ہونے کے باوجود ، اس پر رموزِ حکمرانی اور اسرارِ شہنشاہی کھل جاتے ہیں :

جب عشق سکھاتا ہے ، آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

اقبال اپنے کلام میں جگہ جگہ وجدان کا عقل سے یا عشق کا علم سے مقابلہ و موازنہ کرتے ہیں ۔ اس موازنہ میں عقل و خرد کی خامیوں ، واماندگیوں و نارسائیوں اور عشق و وجدان کی پختہ کاریوں ، کامیابیوں و کامرانیوں کا ذکر مزے لے لے کر کرتے ہیں ۔

اقبال کہتے ہیں کہ عقل کا سارا سرمایۂ حیات "خبر" ہے ۔ "خبر" سے

مراد وہ علم ہے جو انسان مختلف ادوار میں حاصل کرتا اور اس کو ایک سے دوسرے تک پہنچاتا رہا ہے - علم کی جو کچھ پونجی انسان کے پاس ہے ، اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا بیشتر حصہ وہ ہے جو ہمارے پیشروؤں نے حاصل کیا تھا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچایا تھا - اس کا بہت ہی کمتر جزو وہ ہے جس کو ہم نے بطورِ خود حاصل کیا ہے - اس طرح علم کے جو اثاثے اس وقت ہمارے پاس ہیں ان کا بڑا حصہ ہمارے لیے ''شنیدہ'' کی حیثیت رکھتا ہے - پھر جو کچھ ہمارے لیے دیدہ ہے ، یعنی جس کو ہم نے بطورِ خود حاصل کیا ہے ، اس کی نوعیت بھی یہ ہے کہ وہ بھی ظاہری یا سطحی (superficial) ہے ، باطنی یا حقیقی نہیں ہے - مظاہرِ فطرت میں سے ہم اول تو کسی ایک کا انتخاب اپنے مطالعے کے لیے کرتے ہیں ، تمام مظاہر کو بہ یک وقت اپنے مطالعہ کا موضوع نہیں بناتے اور اگر بنائیں بھی تو اس میں کامیابی کا تصور نہیں کر سکتے - علومِ جدیدہ یا سائنس کے اس پہلو پر اقبال نے نہایت خیال افروز تبصرہ کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

''میرے نزدیک تو علومِ طبیعی کی مثال زاغ و زغن کی ہے ، جو فطرت کے مردہ جسم پر جھپٹتے اور اس کا ایک آدھ ٹکڑا نوچ لے جاتے ہیں - - - - علومِ طبیعی یا سائنس کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ جزئی ہو ، اس لیے کہ بہ اعتبار اپنی ماہیت اور وظیفے کے اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ حقیقت کا کوئی واحد اور کامل و مکمل نظریہ قائم کر سکے -''[۳]

الغرض ہم تمام مظاہرِ فطرت کا بوقتِ واحد مطالعہ نہیں کر سکتے - پھر جس مظہر کا ہم مطالعہ کرتے ہیں ، اس کے صرف ظاہری پہلوؤں پر ہی ہماری نظر پڑتی ہے - اس کی ماہیتِ اصلی یا کنہ تک ہماری نگاہ ابھی نہیں پہنچی - علومِ طبیعی کی اب تک کی ساری ترقی اسی ایک شکست کی آواز ہے - مثال کے طور پر ، مادہ کے متعلق جو نظریات ماہرینِ سائنس نے ابتدا میں پیش کیے تھے آج وہ ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں - اقبال لکھتے ہیں :

''قدیم طبعیات نے خود ہی اپنی بنیادوں کی تنقید کرنا شروع کر دی ہے - لہٰذا جس قسم کی مادیت ابتداً اس کے لیے ناگزیر تھی بڑی تیزی سے ناپید ہو رہی ہے -''[۴]

۳- ایضاً ، ص ۶۴ - ۶۵ - ۴- ایضاً ، دیباچہ ، ص ا ح -

اس بیان کی وضاحت اُنھوں نے ایک اور جگہ اس طرح کی ہے :

''۔ ۔ ۔ ۔ طبیعیات نے اپنی اساسات کی تنقید سے خود ہی اس بت کو توڑ ڈالا جیسے اس نے تراشا تھا ، اور وہ اختیاری [empirical] روش جس نے گویا سائنس کو مادیت پر مجبور کر رکھا تھا ، بالآخر مادے ہی کے خلاف بغاوت پر اُتر آئی ۔ ۔ ۔ ۔ مادے کے تصوّر پر سب سے زیادہ ضرب کاری عہدِ حاضر کے مشہور طبیعی آئین شٹائین کے ہاتھوں لگی جس کے اکتشافات نے فکرِ انسانی میں ایک بڑا دُور رس انقلاب پیدا کر دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جمودت کا قدیم تصوّر ختم ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ سارے خصائص بھی جن کی بنا پر مادئین کی کبھی یہ رائے تھی کہ مادے کا وجود ہمارے تیز خرام خیالات سے بھی کہیں زیادہ محکم اور پائدار ہے ۔''[۵]

مادے کے متعلق قدیم نظریہ یہ تھا کہ مادہ ٹھوس ، جامد (solid) چیز ہے ، لیکن اب جوہری توانائی کے سلسلے میں جو مزید تحقیقات ہوئی ہے ، اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جوہر کی ماہیت توانائی (energy) ہے ۔ اقبال کے الفاظ میں :

''اور سائنس کے نزدیک جوہر کی حقیقی ماہیت برق ہے ، نہ کہ کوئی برق آلود شے ۔''[۶]

الغرض یہ ایک حقیقت ہے کہ طبیعیات ہو ، کیمیا ہو یا علومِ جدیدہ کی کوئی اور شاخ ہو ، ان سب کے نظریات متغیر ہوتے رہتے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ یہی تغیر علومِ جدیدہ کی ترقی کا باعث بھی ہے اور ضامن بھی ۔ لیکن اس سے یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ علومِ جدیدہ کی ساری متاع صرف ''خبر'' ہے ، ''نظر'' نہیں ، ''شنید'' ہے ، ''دید'' نہیں ، حقیقت کا ایک پرتو ہے اور وہ بھی جزوی ، حقیقتِ کلّی نہیں ۔ اس کے برعکس اقبال کہتے ہیں کہ وجدان کے پاس ''نظر'' ہے ۔ وہ حقیقت کا چونکہ بالراست ادراک کرتی ہے اس لیے حقیقت اس کے لیے ''دید'' ہے ، ''شنید'' نہیں ۔ وہ حقیقت کا جزواً جزواً نہیں بلکہ کلّی مشاہدہ کرتی ہے ۔ اقبال لکھتے ہیں :

''وجدان اگر بیک وقت تمام حقیقت سے لطف اندوز ہونے کا طلب گار ہے تو فکر اس راستے پر رُک رُک کر قدم اُٹھاتا اور اس کے مختلف اجزا کی تخصیص و

۵- ایضاً ، ص ۵۱ - ۵۲ - ۶- ایضاً ، ص ۷۹ -

تحدید کرتا چلا جاتا ہے تاکہ فرداً فرداً ان کا مشاہدہ کر سکے ۔''[۷]

اسی خیال کو انھوں نے اپنے ابتدائی دور کی ایک چھوٹی سی نظم ''عقل و دل'' میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا — بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر ، گزر فلک پہ مرا — دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا — مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسّر کتابِ ہستی کی — مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تُو لیکن — غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں !
رازِ ہستی کو تُو ''سمجھتی'' ہے — اور آنکھوں سے ''دیکھتا ہوں'' میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
''علم'' تجھ سے تو ''معرفت'' مجھ سے — تو خدا جُو ، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی — اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائرِ سدرہ نا آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرشِ ربِ جلیل کا ہوں میں

''اسرارِ خودی'' میں انھوں نے نہایت پُر سوز انداز میں یہی بتایا ہے کہ ''دانشِ حاضر'' پابندِ مظاہر ہے ، وہ حدودِ ادراک سے باہر نہیں نکل سکی ہے ۔ بالفاظِ دیگر اس کے پاس ''خبر'' ہی ''خبر'' ہے ۔ اس لیے وہ حقیقت کی تلاش میں عقل کی ایسا کھیوں کے سہارے زندگی کے راستے پر چل رہی ہے ۔ اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلے پر خنجر رکھا ہے ۔ اس کے اندر حقیقت کو پانے کی لگن تو ہے ، لیکن یہ لگن سوز سے خالی ہے ۔ اس میں آتشِ شوق تو ہے ، لیکن یہ آتشِ ''لالہ رخ'' ہے ، ''شعلہ رو'' اور ''اخگر صفت'' نہیں ہے ۔ اسی لیے یہ مانند ژالۂ سرد ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپنی دنیائے جستجو میں وہ ناکام و نامراد ہے ۔ اس کے برعکس عشق کے پاس ''نظر'' ہے ۔ اس کے یہاں عقل کی گتھیوں کو سلجھانے کی تدبیر ، اس کی بیماریوں کو رفع کرنے کا نسخہ اور اس کے ناسور کو کاٹ پھینکنے کا نشتر ہے ۔ اس لیے عشق عقل کے لیے بمنزلۂ حکیمِ افلاطون ہے ۔ عقل نے اپنے ذرائع ''خبر'' سے جو سومنات تراشا

۷۔ ایضاً ، ص ۴ ۔

ہے ، عشق کی "نظر" میں اس کے لیے گویا محمود غزنوی ہے ۔ فرماتے ہیں :

دانش حاضر حجاب اکبر است   بت فروش و بت پرست و بت گر است
پا بزندان مظاہر بستۂ   از حدود حس برون ناجستۂ
در صراط زندگی از پا فتاد   بر گلوئے خویشتن خنجر نہاد
آتشے دارد مثال لالہ سرد   شعلۂ دارد مثال ژالہ سرد
فطرتش از سوز عشق آزاد ماند   در جہان جستجو ناشاد ماند
عشق ، افلاطون علت ہاے عقل   بہ شود از نشترش سوداے عقل
جملہ عالم ساجد و مسجود عشق   سومنات عقل را محمود عشق

"جاوید نامہ" میں بھی انھوں نے عقل و وجدان کا مقابلہ کیا ہے ۔ اس کے بعض اشعار میں انھوں نے اپنے اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ عقل کے پاس صرف "خبر" ہے ، مگر وجدان کے پاس "نظر" ہے ۔ عقل کے متعلق فرماتے ہیں :

پس ز ترس راہ چون کورے رود   نرم نرمک صورت مورے رود
تا خرد پیچیدہ تر بر رنگ و بو است   می رود آہستہ اندر راہ دوست
کارش از تدریج می یابد نظام   می ندانم کے شود کارش تمام

اس کے بعد عشق کے متعلق فرماتے ہیں :

می نداند عشق سال و ماہ را   دیر و زود و نزد و دور راہ را
زورعشق از باد و خاک و آب نیست   قوتش از سختئ اعصاب نیست
عشق در جاں چو بچشم اندر "نظر"   ہم درون خانہ ، ہم بیرون در

الغرض "دانش انسانی" کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے خارجی دنیا کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کی ہیں ۔ اسی کارنامے کو اقبال "خبر" سے موسوم کرتے ہیں ۔ ان حاصل کردہ معلومات یا حقایق تک وہ بھی دو منزلوں سے گزر کر پہنچی ہے ۔ پہلی منزل تو مشاہدہ کی ہے اور دوسری دلیل بازی کی ۔ بالفاظ دیگر "دانش انسانی" کا طریقۂ کار ، جیسا کہ قبل ازیں بتایا جا چکا ہے ، یہ ہے کہ وہ خارجی دنیا یا مظاہرۂ فطرت کا جزواً جزواً مشاہدہ کرتی ہے ، پھر ان کو منطقی انداز میں ترتیب دے کر ان سے نتائج اخذ کرتی ہے ۔ اس طریقۂ کار میں "مشاہدہ" پر جتنا زور دیا جاتا ہے ، اتنا ہی استدلال عقلی یا منطقی حجت پر بھی زور دیا جاتا ہے ۔ اس کے برعکس عشق یا وجدان حقیقت مطلقہ یا حقیقت کلی کا دو بدو نظارہ کرتا ہے ۔ جہاں صغریٰ و کبریٰ ، استخراج و استقرا کا گورکھ دھندا

نہیں ہے - جو کچھ ہے ، آمنے سامنے ہے - اسی لیے وہ عقل کو "دانشِ برہانی" اور عشق کو "دانشِ نورانی" سے تعبیر کرتے ہیں ، اور کہتے ہیں کہ دانشِ برہانی سے حقیقت تو حاصل نہیں ہوتی ، البتہ انسان کی حیرت و استعجاب میں اضافہ ہو جاتا ہے :

اک دانشِ نورانی ، اک دانشِ برہانی ہے دانشِ برہانی ، حیرت کی فراوانی

انھوں نے دیارِ مغرب میں رہ کر اسی دانشِ برہانی میں مہارت حاصل کی تھی ، لیکن بعد میں وہ وجدان کی بصیرت سے لذت اندوز ہوئے تھے - اُس بصارت اور اِس بصیرت میں جو فرق ہے ، اس کا انھیں پوری طرح احساس ہے - اِس بصارت نے گو دلائل کا انبار لگا دیا تھا ، تاہم یہ انبارِ حقیقت اسی کی راہ میں حجاب بن گیا تھا ، مگر اس بصیرت نے انھیں حقیقت کے روبرو کر دیا - حضوری کی اس لذت اور دلیل بازی کے اُس حجاب کا فرق صرف محسوس کرنے کی چیز ہے ، بیان کرنے کی نہیں - فرماتے ہیں :

مجھے وہ درسِ فرنگ یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت ، کہاں حجابِ دلیل !

وجدان اقبال کی نظر میں اسباب و علل کی غلام گردشوں میں آنکھ مچولی کا کھیل نہیں ، بلکہ کھلے میدان کی چوگان بازی ہے :

عقل در پیچاک اسباب و علل عشق چوگان باز میدانِ عمل

عقل چونکہ دلائل کی بیساکھیوں کی مدد سے حقایق کی تلاش میں راستہ طے کر رہی ہے ، اس لیے وہ قدم قدم پر لڑکھڑا جاتی ہے - اس کو تشکک کے گرد و غبار سے نجات نہیں ملتی ، اسی لیے وہ یقین کے نور اور ایمان کی روشنی سے محروم ہے - اس کے برخلاف عشق دلائل کی اوٹ کو چاک کر کے براہِ راست حق کا مشاہدہ کرتا ہے - اس لیے اس کے پاس ایمان کی روشنی اور ایقان کی حرارت ہے - فرماتے ہیں :

عقل را سرمایہ از بیم و شک است عشق را عزم و یقین لاینفک است
علم در اندیشہ می گیرد مقام عشق را کاشانہ قلبِ لاینام

اسی خیال کو انھوں نے اپنے "خطبات" میں اس طرح واضح کیا ہے :

"تجربہ کہتا ہے کہ جس حق و صداقت کا انکشاف عقلِ محض کی وساطت سے ہو ، اس سے ایمان و یقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی و تنزیل کی

بدولت ہوتی ہے - یہی وجہ ہے کہ عقلِ محض نے انسان کو بہت کم متاثر کیا - برعکس اس کے مذہب کو دیکھیے تو اس نے افراد میں اضافۂ مراتب کے ساتھ ساتھ معاشروں تک کو بدل ڈالا -''[۸]

ایمان کے اس نور اور ایقان کی اس حرارت کی بدولت وجدان یا عشق میں ایک قسم کی جرأتِ رندانہ پیدا ہو جاتی ہے ، جو اس کو کارزارِ ہستی میں جوش و خروش سے حصہ لینے کے لیے آمادہ کرتی ہے - پھر اسی جوش و جذبۂ اخلاص کے باعث اس سے ایسے حیرت انگیز کارنامے سرزد ہوتے ہیں جس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے - فرماتے ہیں :

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل — عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

یہ جرأت عقل میں کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے ، جب کہ وہاں جذبات کے سوتے خشک پڑے ہوئے ہیں - عقل کے متعلق فرماتے ہیں :

چشمش از ذوقِ نگاہ بیگانہ نیست — لیکن او را جرأتِ رندانہ نیست

مختصراً یہ کہ عقل و خرد کے پاس صرف ''خبر'' ہے - وہ دلیل و حجت کے چکر میں گرفتار اور بے یقینی و تشکک کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے ، پھر جرأتِ رندانہ سے محرومی کے باعث اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ پاتی ہے - اس کے برخلاف عشق و وجدان کے پاس نظر ہے ، حضوریت ہے ، ایمان و ایقان کی دولت ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ جرأتِ رندانہ سے کام لے کر اپنی منزل پا لیتی ہے - علم یا عقل کی یہی وہ مہجوریاں و محرومیاں ہیں اور عشق و وجدان کی یہی وہ کامیابیاں اور کامرانیاں ہیں جن کی وجہ سے اقبال عشق کو علم پر ، وجدان کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں - انھوں نے اپنی ایک مرصع نظم میں مندرجہ بالا حقایق کا بڑے فن کارانہ انداز میں اظہار کرتے ہوئے ''عشق'' کی ''عقل'' یعنی ''علم'' پر برتری اور افضلیت کو واضح کیا ہے - فرماتے ہیں :

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن !
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمیں وطن !
بندۂ تخمینِ وطن ! کرمِ کتاب نہ بن !
عشق سراپا حضور ، علم سراپا حجاب !

۸- ایضاً ، ص ۲۷۶ -

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات !
علم مقامِ صفات ، عشق تماشائے ذات !
عشق سکون و ثبات ، عشق حیات و ممات !
علم ہے پیدا سوال ، عشق ہے پنہاں جواب !

عشق کے ہیں معجزات سلطنتِ فقر و دیں !
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں !
عشق مکاں و مکیں ! عشق زماں و زمیں !
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب !

شرعِ محبت میں ہے ، عشرتِ منزل حرام !
شورشِ طوفاں حلال ، لذتِ ساحل حرام !
عشق پہ بجلی حلال ، عشق پہ حاصل حرام !
علم ہے ابن الکتاب ، عشق ہے ام الکتاب !

عقل و عشق یا خرد و وجدان کے اس مقابلے ، آویزش اور معرکۂ آرائی کو دیکھتے ہوئے وہ بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں :

تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ ، عقل تمام بولہب
صدق خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

پھر عشق کی اسی فضیلت و برتری کے باعث وہ عقل کو نہیں بلکہ عشق ہی کو اپنا رہبر ، پیشوا اور امام بناتے ہیں :

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من ، عقل است غلامِ من

اپنے متعلق کہتے ہیں کہ میں نے دانشِ حاضر کے چاند ستاروں کی روشنی میں خوب فلک پیمائی کی ، مگر نتیجہ کیا نکلا ، یہ مجھ سے نہ پوچھو - بس صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ''عقلِ ذو فنوں'' ''دانشِ پرفسوں'' سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے دلِ خود پسند کا عشق کی ''تیغ جگر دار'' سے خون کر لیا ہے - یوں سمجھ لو کہ وہ جس کو تم عصرِ حاضر کا ایک ژرف نگاہ دانش ور سمجھتے

تھے ، اب ''دیوانہ و مجنونے رسوا سرِ بازارے'' بن گیا ہے :

گریز از عقل ذو فنوں کرد　　دلِ خود کام را از عشق خوں کرد
ز اقبالِ فلک پیما چہ پرسی　　حکیمِ نکتہ دانِ ما جنوں کرد

گویا اب عشق ہی اقبال کا سرمایۂ حیات اور حاصلِ زندگی ہے ، اور چونکہ ابھی تک ''آدم'' ''عقل و خرد'' کی پرانی ڈگر پر چل رہا ہے اس لیے وہ عشق کو آواز دیتے ہیں کہ میری مٹی سے ایک ''نیا آدم'' تخلیق کر ۔ فرماتے ہیں :

بیا اے عشق اے رمزِ دل ما　　بیا اے کشتِ ما ، اے حاصلِ ما
کہن گشتند ایں خاکی نہاداں　　دگر آدم بنا کن از گلِ ما

مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان ، جس کو عشق کا درس دیا گیا تھا اور جس کو سراپا عشق ہی عشق ہونا چاہیے تھا ، اب اس کے اندر ''عشق و محبت'' کا شعلہ بجھ چکا ہے ، تو وہ چلا اُٹھتے ہیں :

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　مسلماں نہیں ، راکھ کا ڈھیر ہے

اسی لیے وہ جاوید کو ، جو دراصل اقبال کے ذہن میں نوجوان نسل کی ایک علامت (symbol) ہے ۔ مخاطب کر کے کہتے ہیں :

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر　　نیا زمانہ ، نئے صبح و شام پیدا کر

* * *

چون نرگس ایں چمن نادید مگزر　　جو بو در غنچۂ پیچیدہ مگزر
ترا حق دیدۂ روشن ترے داد　　خرد بیدار ، و دلِ خوابیدہ مگزر

(۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے علم پر عشق کو ، خرد پر جنوں کو ، عقل پر وجدان کو ترجیح دی ہے ، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُنھوں نے عقل کو بالکلیہ ترک کر دینے یا دانشِ حاضر کو خیر باد کہہ دینے کی تلقین کی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ اُنھوں نے عشق کا نعرۂ مستانہ کچھ اس زور سے لگایا ہے کہ اس کی گونج سے ''عقلِ خجستہ پا'' کچھ لڑکھڑاتی ہوئی سی نظر آتی ہے ۔ اصل بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں دانشِ حاضر کے افسوں نے کچھ ایسا طلسم باندھا ہے کہ عصرِ حاضر کے انسان اور خصوصاً نئی پود کی آنکھیں اس کی

رنگا رنگیوں سے خیرہ ہوئی جا رہی ہیں ۔ اقبال نے یہ محسوس کیا کہ اس سحرِ سامری کو توڑنے کے لیے ضربِ کاری بلکہ ضربِ کلیمی کی ضرورت ہے ۔ اسی لیے انھوں نے عشق کی ''تیغِ جگر دار'' کو اپنے سوز و ساز سے صیقل کر کے "دانشِ حاضر'' کے قلعہ' 'پر فتن پر حملہ کیا ہے ۔ اس سے ان کا اگر کچھ مقصد ہے تو صرف اس قدر کہ نئی نسل یا عصرِ حاضر کا انسان صرف عقل کا غلام ہو کر نہ رہ جائے ، بلکہ عقل کے ساتھ ساتھ حقیقت رسی کے ایک دوسرے ذریعے — وجدان — کی طرف بھی رجوع کرے ۔ اسی لیے تو وہ کہتے ہیں :

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ''عقل'' اور ''وجدان'' کے مابین کوئی مثبت رشتہ اور تعلق نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان اگر کوئی نسبت ہے تو وہ منفی قسم کی ہے ۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں میں حدِ فاصل قائم ہے ۔ اقبال کے نزدیک یہ تصورات غلط فہمی پر مبنی ہیں ۔ فکر و وجدان کے متعلق ان کا تصور یہ ہے کہ نہ تو ان میں کوئی تضاد پایا جاتا ہے اور نہ ان میں کوئی حدِ فاصل قائم ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''۔۔۔ اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ فکر اور وجدان بالطبع ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں ۔ ایک جزواً جزواً حقیقت مطلقہ پر دسترس حاصل کرتا ہے ، دوسرا من حیث الکل ۔ ایک کے سامنے حقیقت کا دوامی پہلو ہے ، دوسرے کے [سامنے] زمانی ۔ گویا وجدان اگر بیک وقت تمام حقیقت سے لطف اندوز ہونے کا طلب گار ہے تو فکر اس راستے پر رک رک کر قدم اٹھاتا اور اس کے مختلف اجزا کی تخصیص و تجدید کرتا چلا جاتا ہے تاکہ فرداً فرداً ان کا مشاہدہ کر سکے ۔ دونوں اپنی تازگی اورتقویت کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور دونوں اس حقیقت کے لقا کے آرزومند جو باعتبار اس منصب کے جو انھیں زندگی میں حاصل ہے ، ان پر منکشف ہوتی رہتی ہے ۔ دراصل وجدان جیسا کہ برگساں نے نہایت ٹھیک کہا ہے فکر ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے ۔''[۹]

اب رہی یہ بات کہ فکر و وجدان میں کوئی تعلق یا رشتہ نہیں ہے ، بلکہ ان کے مابین حدِ فاصل قائم ہے ، تو اقبال نے اس خیال کی بھی تردید کی ہے ۔

۹۔ ایضاً ، ص ۳ - ۴ ۔

اُنھوں نے اپنے ''خطبات'' میں عقل پر امام غزالی کی تنقید کا ذکر کیا ہے ۔ اسی سلسلے میں وہ لکھتے ہیں :

''۔ ۔ ۔ امام موصوف یہ نہیں سمجھے کہ فکر اور وجدان میں ایک نامی رشتہ کام کر رہا ہے ۔''[۱۰]

گویا اقبال کا خیال یہ ہے کہ فکر اور وجدان ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہیں بلکہ ان کے آپس میں ایک رشتہ کام کر رہا ہے ، جس کو اگر صحیح نہج پر نشو و نما دی جائے تو باہم ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہوگا ۔

فکر چونکہ محدود ہوتا ہے ، اس لیے وہ لامحدود کو نہیں سمجھ سکتا ۔ اقبال کے نزدیک یہ تصور بھی علمی دنیا میں ایک غلط فہمی پر مبنی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل عملِ تفکر میں بتدریج اپنی محدودیت پر غالب آ جاتی ہے اور پھر اس محدودیت کے حصار کو پھلانگ کر وہ وجدان کی سرحدوں کو چھو لیتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''۔ ۔ ۔ علم کے ہر عمل میں فکر اپنی متناہیت سے تجاوز کر جاتا ہے ۔ فطرت کے متناہی اجزا تو بے شک ایک دوسرے سے الگ اور منفرد رہتے ہیں ، مگر فکر کے متناہی اجزا کی یہ صورت نہیں ۔ فکر بالطبع تحدید سے آزاد ہے اور اس لیے یہ ممکن نہیں کہ اپنی انفرادیت کے تنگ حلقے میں مقید رہے ۔ اس کے ماورا جو وسیع عالم ہے اس میں کوئی شے بھی اس سے بے گانہ نہیں بلکہ یہ بظاہر وہی بے گانہ عالم ہے جس کی زندگی میں بتدریج حصہ لیتے ہوئے فکر اپنی حدود کو توڑ ڈالتا اور اس متناہیت سے لطف اندوز ہوتا ہے جو بالقوہ اس میں پوشیدہ ہے اور جس کا مطلب یہ ہے کہ فکر میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو محض اس لیے کہ اس کی متناہیت میں لامتناہی بھی مضمر رہتا ہے ۔ وہی اس کے شعلۂ آرزو کو برقرار رکھتا اور وہی اس کی بے پایاں جستجو میں اس کو سہارا دیتا ہے ۔''[۱۱]

ایسی عقل ، جو اپنی محدودیت کو توڑنا اور لامتناہی سے ہم کنار ہونا چاہتی ہے ، اقبال کے نزدیک پسندیدہ اور محمود ہے ، کیونکہ وہ عشق و وجدان کی سرحد پر کھڑی ہوتی ہے ۔ البتہ ان کی نگاہ میں وہ عقل نامحمود اور ناپسندیدہ ہے جس پر دانشِ حاضر نے اپنی چھاپ لگا کر اسے خارجی مظاہر کی چار دیواری میں بند کر رکھا ہے ۔ اقبال اول الذکر کو ''عقلِ جہاں بیں'' اور

۱۰ - ایضاً ، ص ۸ ۔ ۱۱ - ایضاً ، ۱۰ ۔

ثانی الذکر کو ''عقلِ خودبیں'' کا لقب دیتے ہیں ۔ پھر ان دونوں میں جو فرق ہے ، اس کو اس طرح اُجاگر کرتے ہیں :

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہان بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آنکہ برد دانۂ افتادہ ز خاک
آنکہ گیرد خویش از دانۂ پرویں دگر است
دگر است آنکہ زند سیر چمن مثلِ نسیم
آنکہ داشد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگر است
دگر است آن سوے 'نہ پردہ کشادن نظرے
ایں سوے پردہ گماں و ظن و تخمیں دگر است
اے خوشا آں عقل کہ پہنائے دو عالم ما اوست
نورِ ما فرشتۂ سوزِ دل آدم با اوست

یہی وہ عقلِ جہاں بیں ہے جس کے ڈانڈے وجدان سے جا ملتے ہیں ۔

اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ وجدان میں بھی ایک رنگ فکر کا اور ایک عنصر تعقل کا پایا جاتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''۔۔۔ ہمارے دوسرے احساسات کی طرح صوفیانہ احساس [بالفاظِ دیگر وجدان] میں بھی تعقل کا ایک عنصر شامل رہتا ہے اور میں سمجھتا ہوں یہی مشمول تعقل ہے جس سے بالآخر اس میں فکر کا رنگ پیدا ہوتا ہے ۔''[۱۲]

سیدھے سادے الفاظ میں اقبال کے ان اقتباسات کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ماہیتِ اصلی کے لحاظ سے ایک طرف عقل میں وجدانی کیفیت پائی جاتی ہے تو دوسری طرف وجدان میں فکری رنگ ملتا ہے ، گویا عقل و عشق یا فکر و وجدان کے مابین نقطۂ اتصال موجود ہے ۔ اسی نقطۂ اتصال کی تعمیر و ترقی ، تہذیب و ترتیب اور نشو و نما اقبال کے کلام کا منشائے اصلی ہے ۔ اقبال کے کلام میں عقل و وجدان یا عشق و خرد کی جو آویزش نظر آتی ہے اس کا مقصد ایک کی تخریب سے دوسرے کی تعمیر نہیں ہے ، بلکہ ان کی آمیزش سے عصرِ حاضر کے انسان کی ذہنی و روحانی ، دنیوی و دینی تعمیر و ترقی پیشِ نظر ہے ۔

اقبال کی نظر میں انسانیت کی کامیابی کے لیے علم (عقل) اور عشق کی

۱۲- ایضاً ، ص ۳۱ -

ہم آہنگی نہایت ضروری ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

علم تا از عشق برخوردار نیست — جز تماشا خانۂ افکار نیست
ایں تماشا خانہ سحرِ سامری است — علم بے روح القدس افسوں گری است
علم بے عشق است از طاغوتیاں — علم با عشق است از لاہوتیاں
بے محبت علم و حکمت مردۂ — عقل تیرے برہدف ناخوردۂ

علم (عقل) کے ساتھ اگر وجدان کی روشنی شامل ہو جائے تو زندگی کے سفر میں وہ انسان کا نہ صرف بہترین ساتھی ہے بلکہ رہبر و رہنما بھی ہے ۔ اسی روشنی میں وہ اپنے خول سے باہر نکل آتا ہے اور رازِ وجود کو افشا کر دیتا ہے ۔ پھر تو سفر کی منزلیں آسان ہو جاتی ہیں ، کیونکہ وہ نہ صرف راہوں کو ہموار کرتا ہے ، بلکہ جذبۂ شوق کو اُبھارتا بھی ہے ۔ ایسا ''علم'' خارجی دنیا کی تفسیر بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا ، بلکہ داخلی دنیا یعنی شعورِ ذات کی تعبیر اور تعمیر میں مدد دیتا ہے ۔ وہ اس داخلی دنیا کی گہرائیوں میں انسان کو جذب و شوق کی اس منزل تک لے جاتا ہے جہاں پہنچ کر جبرئیلِ امین کے پَر جلنے لگتے ہیں ۔ اقبال کہتے ہیں :

علم را مقصود اگر باشد نظر — می شود ہم جادہ و ہم راہبر
می نہد پیش تو از قشرِ وجود — تا تو پرسی چیست راز ایں نمود
جادہ را ہموار سازد ایں چنیں — شوق را بیدار سازد ایں چنیں
علم تفسیرِ جہانِ رنگ و بُو — دیدہ و دل پرورش گیرد از اُو
بر مقامِ جذب و شوق آرد ترا — باز چوں جبریل بگزارد ترا

وہ کہتے ہیں کہ دانشِ حاضرہ کی آفریدہ عقل کو اگر بے مہار چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنا تعلق شیطان سے پیدا کر لیتی ہے ، لیکن اس کی تکیل وجدان کے ہاتھوں میں دے دی جائے تو وہ اتنی لطیف و نطیف ہو جاتی ہے کہ اس کی جبیں سے شانِ یزدانی جھلکنے لگتی ہے :

عقل اندر حکم دل یزدانی است — چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

اقبال کہتے ہیں کہ علومِ وجدانی کا سرچشمہ ''الکتاب'' یعنی قرآن مجید ہے اور علومِ دنیوی کا مخزن حکمت یا سائنس ہے ۔ ملتِ اسلامیہ کے لیے سامانِ حیات اور سرمایۂ شوکت و قوت اگر کچھ ہے تو بس یہ دو ہی ہیں ۔ ایک دنیائے ذوق و شوق یعنی عالمِ بالا کے دروازوں کو کھول دیتی ہے اور دوسری

دنیائے آب و گل یعنی عالمِ خاکی کو اسیر کر لیتی ہے ۔ اس طرح ان کے امتزاج سے مومن دونوں جہانوں کی تسخیر کر سکتا ہے ۔ یہ دونوں حقیقت میں خدائے بزرگ و برتر اور پروردگارِ لم یزل کے انعامات ہیں انسانیت کے لیے ۔ ایک شانِ جمالی کی آئینہ دار ہے تو دوسری کیفیتِ جلالی کا مظہر ۔ اسی لیے مومن کو چاہیے کہ ان دونوں سے استفادہ کرے ۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے معاند و مخالف نہیں ، معاون و مددگار ہیں ۔ وجدان کے تعاون ہی سے علم و دانائی کو حق شناسی کا موقع نصیب ہوتا ہے اور علم و دانائی کی مدد سے عشق و وجدان کے کارناموں کی بنیادیں محکم و استوار ہوتی ہیں ۔ فرماتے ہیں :

برگ و ساز کتاب و حکمت است　　این دو قوت اعتبارِ ملت است
آن فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق　　این فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعامِ خدائے لایزال　　مومناں را آن جمال است این جلال
زیرکی از عشق گردد حق شناس　　کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

اقبال نے ''پیامِ مشرق'' کی ''محاورۂ علم و عشق'' والی نظم میں فن کارانہ دلآویزیوں کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اگر علم و عشق یا عقل و وجدان کا باہم امتزاج ہو جائے تو اس عالمِ مکر و فسوں اور دنیائے حرب و ضرب کو ڈھا کر اسی کے آب و گل سے ایک نیا عالم بنایا جا سکتا ہے اور اس کی موجودہ ہیئتِ کذائی کو بدل کر ایک نیا نقش و نگار عالم تیار کیا جا سکتا ہے ۔ اسی بات کو وہ ایک شعر میں اس طرح بیان کرتے ہیں :

عشق چوں با زیرکی ہم بر شود　　نقش بندِ عالم دیگر شود

اسی لیے عصرِ حاضر کے انسان اور دورِ جدید کے نوجوان کے نام ان کا پیام ہے :

خیز و نقش عالم دیگر بنہ　　عشق را با زیرکی آمیزدہ

لیکن یہ کارنامہ انجام پذیر ہوگا تو صرف ایک ہی طریقے سے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ عقل و خرد کو علمِ جدید و دانشِ حاضر کو عشق و وجدان سے ہم کنار کر کے مسلمان کیا جائے اور اس کو اس طرح کشتۂ شمشیرِ قرآن بنایا جائے :

خوشتر آن باشد مسلمانش کنی　　کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

بسلسلۂ صد سالہ تقریبات ولادت حکیم الامت علامہ محمد اقبال

(۱۹۷۷ - ۱۸۷۷)

۱- ''علم‌الاقتصاد'' از محمد اقبال — دوسرا ایڈیشن زیر طبع

۲- ''اسلامی تصوف اور اقبال'' از ابو سعید نورالدین — ,, ,,

۳- ''اسرار و رموز پر ایک نظر'' از پروفیسر محمد عثمان — ,, ,,

۴- ''اقبال اور سیاست'' از رئیس احمد جعفری — ,, ,,

۵- ''انوار اقبال'' از بشیر احمد ڈار — ,, ,,

۶- ''اقبال'' از عطیہ بیگم - مترجم ضیاالدین برنی — ,, ,,

۷- ''اقبال کے آخری دو سال'' از عاشق حسین بٹالوی — تیسرا ایڈیشن ,,

۸- *The Sword and the Sceptre* by Dr. Riffat Saud. — ,, ,,

۹- *The Concept of Perfect Man* by Dr. Hassiena Sheikh — ,, ,,

۱۰- *The Essential Aspects of Iqbal's Philosophy of Religion* by Dr. Mir Valiuddin — ,, ,,

اقبال اکادمی پاکستان

۹۰/بی - ۲ ، گلبرگ ۳ ، لاہور ، فون نمبر ۸۱۵۰۷

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006